پریم چند

بناس سے چند میل کے فاصلے پر 'لمہی' نام کا ایک گانو ہے۔31 جولائی 1880ء کو اسی گانو میں پریم چند کی پیدائش ہوئی۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ وہ گھر میں نواب رائے کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔ یہی اُن کا ابتدائی قلمی نام بھی تھا۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ ان کے دادا گُر سہائے لال پٹواری تھے۔

اپنے گانو کی قریبی بستی میں ایک درزی سے، جو پڑھاتے بھی تھے، انھوں نے اردو اور فارسی کے کچھ اسباق پڑھے۔ پریم چند ابھی آٹھ سال کے بھی نہیں تھے کہ ان کی والدہ آنندی دیوی کا انتقال ہوگیا۔ ماں کی وفات کے بعد دادی نے ان کی پرورش کی ذمّے داری سنبھالی۔ 1897ء میں ان کے والد کا بھی وصال ہوگیا، اس وقت پریم چند نویں درجے کے طالبِ علم تھے۔ اب گھر کے اخراجات کا ذمّہ انھی کے سر پر آن پڑا۔ انھوں نے ٹیوشن پڑھا کر بڑی مصیبتوں سے اپنے دن کاٹے۔ 1900ء میں بہرائچ کے گورنمنٹ اسکول میں ان کی تقرّری ہوئی۔ کان پور کے ضلع اسکول میں ملازمت کے دوران اُن کی دوستی ''زمانہ'' کے مدیر دیا نرائن نگم سے ہوئی۔ انھوں نے پرائیوٹ طور پر بی۔ اے۔ کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ 1906ء میں پریم چند کی ایک بیوہ عورت شِورانی دیوی سے شادی کے بعد ان کی گھریلو زندگی میں سکون کی کیفیت پیدا ہوئی۔ 1919ء میں جب جلیاں والہ باغ کا واقعہ پیش آیا تو پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انھوں نے بنارس میں سرسوتی پریس لگایا۔ یہیں سے انھوں نے 1930ء میں ''ہنس'' نام کا ایک پرچہ ہندی زبان میں جاری کیا۔ ''جاگرن'' کے نام سے ایک اخبار بھی نکالا۔ وہ بمبئی میں فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہوئے لیکن وہاں انھیں مایوسی ہاتھ آئی۔ اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں ترقّی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس ہوئی تو پریم چند نے اس کا خطبہ صدارت پڑھا۔ وہ روسی مصنّف میکسم گورکی کے تعزیتی جلسے میں بھی اپنی شدید بیماری کے باوجود شریک ہوئے۔ 8 اکتوبر 1936ء کو پریم چند کا انتقال ہوگیا۔

پریم چند کا ادبی ذوق کم عمری میں ہی پروان چڑھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں انھوں نے لکھنا شروع کیا جس کا سلسلہ ان کے وصال تک جاری رہا۔ انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، اور مضامین لکھے جن کے مجموعوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔ ''پریم پچیسی''، ''پریم بتیسی''، ''آخری تحفہ''، ''زادِراہ'' اور ''واردات'' وغیرہ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ 1908ء میں ''سوزِ وطن'' کے نام سے شائع شدہ ان کے ابتدائی پانچ افسانوں کے مجموعے کو انگریزی سرکار نے ضبط کرلیا تھا۔ ''بازارِ حسن''، جلوۂ ایثار''، ''چوگانِ ہستی''، ''میدانِ عمل''، ''نرملا'' اور ''غبن'' ان کے ناول ہیں۔ ''گئودان نہ صرف پریم چند بلکہ اردو کا ایک اہم ناول ہے۔

پریم چند گاندھیائی فکر سے بے حد متاثّر تھے۔ ان کی تخلیقات میں اس فکر کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی اور وہاں کی معاشرت کو اپنا خاص موضوع بنایا اور جاگیردارانہ استحصال اور جبر و استبداد پر تفصیل سے لکھا۔ ان کی تخلیقات میں ان کے عہد کے ہندستان کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو فکشن نے بہت سے نشیب و فراز طے کیے لیکن سرد و گرم ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا اُن کا فن آج بھی تاب دار ہے۔ ان کا فن اردو فکشن کے شعور کا حصّہ بن چکا ہے جسے کبھی زوال نہیں۔

پریم چند

مختصر افسانہ

روشنی

آئی۔ سی۔ ایس۔ پاس کر کے ہندستان آیا تو مجھے ممالکِ متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی؟ میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی۔ اس لیے سیر و شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے! سوچتا تھا، وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا، پھاگن کا مہینہ۔ مَیں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے جگن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا کیوں کہ اُن دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا: چلو، بیٹا چلو۔ ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے جگن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیے گئے تھے۔

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی؛ اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صَرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقات اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتّے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرّس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دَوا دوِش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو، اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کُن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سَلَف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلّغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں اسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا لیکن اس سَلَف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعلِ ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت و حرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشیں فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔

میں انھیں تصوّرات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی

جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا، اُفق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا، آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لمحہ بہ لمحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی۔ وہ پردۂ غبار سر پر آپہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تُند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الاماں۔ گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ سنگ ریزے گرد کے ساتھ اُڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلّط ہوگئی۔ کسی درخت کے اُکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں ہی بڑے بڑے تودے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے، ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سُجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آکر صفایا کردے گا۔ دل پر بے اختیار رقّت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے۔ اوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھُس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سُن کر میں چونک پڑا۔ اس اژّاہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آ رہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی۔ مگر اسے راستہ کیوں کر سوجھ رہا ہے؟ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائے۔ کوئی زمین دار ہوگا، مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمّت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آگئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جا رہی ہے۔ نہ آندھی کا خوف ہے، نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم۔ گویا یہ بھی کوئی روز مرّہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا۔ ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا۔ ''او عورت! ذرا ٹھہر جا، گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟'' عورت رُک گئی۔ اس نے میرے قریب آکر، مجھے دیکھ کر ذرا سر جھکا کر کہا۔ ''کہاں جاؤ گے؟''

گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلیے آؤ۔ آگے ہمارا گانو ہے۔ اس کے بعد گجن پور ہے۔''

''تمھارا گانو کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔''

''تم اس آندھی میں کہیں رُک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رُک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔'' آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد وغبار کی ایک دھونکنی سی منھ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا، مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا، اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے؟ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم؟ موت تو اسے باعثِ نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔

میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منھ چھپالیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پاکر بالو میں سر چھپالیتا ہے۔

وہ آندھی کی آخری سانس تھی، اس کے بعد بہ تدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہوگیا۔ نہ گرد وغبار کا نشان تھا، نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آگئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی، اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تھا۔ میں جوں ہی اس گانو میں پہنچا۔ وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمھیں ڈھونڈنے جا رہی تھی۔

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا، ''میں اس کے لیے تمھارا بہت ممنون ہوں'' آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہوگیا۔ یہی تمھارا گانو ہے؟ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہوگا؟

''بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے، کہیں داہنے بائیں مُڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔''

''یہی تمھارا بچہ ہے''؟

''نہیں، ایک اور اس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھوپڑیا کہیں اُڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں، یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے، تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان ہے۔ بڑا لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے لیے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں، من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث اندازِ گفتگو، اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا۔ اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔ پوچھا، ''تمھیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہوگئے۔''

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی: ''ابھی

توکل چھے مہینے ہوئے ہیں، بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا۔ بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔ بس آنکھیں بند ہوگئیں۔ نہ کچھ کہانہ سُنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچّوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھیے بیچ کر انھیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔ بھگوان تمھارے ان دونوں گلابوں کو جلا دے، میرے لیے یہی بہت ہیں۔"

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، "میری طرف سے یہ بچّوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو، مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا"۔ یہ کہہ کر میں نے بچّے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے، میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں"۔

"یہ بھیک نہیں ہے، بچّوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔"

"نہیں بابو جی۔"

"مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔"

"نہیں بابو جی۔ جس سے بیاہ ہوا، اس کی عزّت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمھارا بھلا کریں۔ اب چلے جاؤ، نہیں تو دیر ہو جائے گی۔"

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل کو ر باطن، بے خبر سمجھتا تھا۔ اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلا ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "تمھیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟"

عورت مسکرائی، "ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آکر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پور اکیلے نہ جا پاتے۔ جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تھوڑی خدمت کرتا۔"

گھوڑا اڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا، جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے، وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اُڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارۂ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپا لوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

گجن پور ابھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ بیہڑ، بے برگ و بار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کا

خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا چلا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اَب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رَعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی اس نئی تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا، اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکا یک سامنے ایک کفِ دست میدان آ گیا جس کے پرلے سرے پر جگن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اُڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اُڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

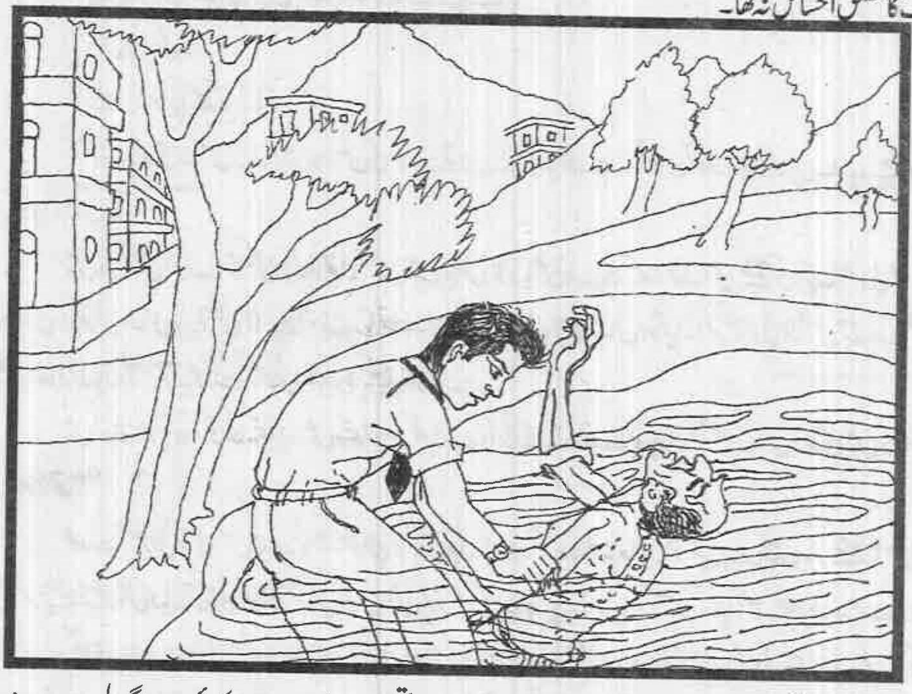

ایک میل نکل گیا ہوں گا، ایک رپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا، ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہو گی کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلّا کر کہا۔ ''بڈّھے اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی

میں رگر پڑا۔اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔میں ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیّت نے اسے گوارا نہ کیا۔زیادہ پس وپیش کا موقع نہ تھا۔میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے،میں پانی میں کود پڑا۔ہاتھی ڈُباو پانی تھا۔رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی،وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنادی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔میں بھی ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیرنا جانتا تھا،کوئی اندیشہ نہ تھا۔میں نے دوسری ڈُبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔جسم بے جان ہو رہا تھا۔میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا۔دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔کبھی سر پر،کبھی شانے پر،کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔میں تلملا اٹھتا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو،میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرّت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔وہ فاتحانہ مسرّت تھی۔میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔خاص کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں۔میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ہر لحظہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے۔مگر میں خوش تھا کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ایک زمانہ ہوا،میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی،وہ اس وقت کام آئی۔میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بیٹھا دیا۔اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔اولے نکل گئے تھے۔میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔رومال سے ساز کو صاف کیا اور بجن پور چلا۔بے خوف،بے خطر،دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔اسی وقت اندھے نے پوچھا"تم کون ہو بھائی،مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔"

میں نے کہا،"تمھارا خادم ہوں۔"

"تمھارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔"

"وہ کون دیوی ہے؟"

"وہ دیوی پیچھے کے گانو میں رہتی ہے۔"

"تو کیا وہ عورت ہے؟"

"نہیں،میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔"

لفظ و معنی

مُراد بَر آنا	-	مقصد پورا ہونا
کوہستانی	-	پہاڑی
بَور آنا	-	آم کے درخت میں پھول لگنا
کاشت کار	-	کھیتی کرنے والا، کسان
ربیع	-	وہ فصل جو اکتوبر-نومبر میں بوئی اور مارچ-مئی میں کاٹی جائے، خریف کی ضد
مزرعہ	-	کھیتی
بوسیدہ	-	پرانا
تحقیق	-	کسی چیز کے بارے میں پوری طرح سے جاننا، چھان بین
تغیر	-	بدلاو، تبدیلی
مدرّس	-	درس دینے والا، پڑھانے والا
نیم	-	آدھا
غنودگی	-	اونگھ، نیند
دوا دوش	-	ہر طرف دوڑنا، دوڑ دھوپ
جمود	-	رُکا ہوا، بے حرکت
غلبہ	-	حاوی
سَلَف	-	پہلے لوگ، پُرکھے
مَشعل	-	شمع، چراغ
کُرَہ	-	گنبد، گولا، ہر گول چیز
کُرَۂ ارض	-	پوری زمین
صنعت و حرفت	-	ہاتھ یا مشین سے چیزیں بنانا، انڈسٹری، پیشہ، کاری گری
برہنہ	-	ننگا
حَجَر	-	پتھر
بسیط	-	کشادہ
تُند	-	تیز، غضب ناک
اُفُق	-	آسمان کا کنارہ
الامان	-	کلمۂ خوف، امن، پناہ

ایال	-	گھوڑے کی گردن کے لمبے بال
مسلّط	-	وہ جو کسی پر غالب کر دیا جائے
ہیجان	-	جوش، تیزی، بھڑک
رِقّت	-	دل بھر آنا، مجازاً رونا
تحت الثریٰ	-	زیرِ زمین، زمین کا سب سے نیچے کا حصّہ، پاتال
دل فریبی	-	خوب صورتی، من موہ لینا
ناز برداری	-	ناز اٹھانا، ناز یا چونچلے کا برداشت کرنا
بہ تدریج	-	درجہ بہ درجہ، تھوڑا تھوڑا، آہستہ آہستہ
دھاپ	-	میل بھر، انسان کے ایک سانس میں دوڑنے کا فاصلہ
اثر پذیر	-	اثر قبول کرنا
تسخیر	-	تابع کرنا، قابو میں لانا
خفیف	-	شرمندہ، ہلکا
کور باطن	-	کینہ پرور، دل میں کینہ رکھنے والا، حاسِد
توکّل	-	خدا پر بھروسہ کرنا
فی الاصل	-	اصل میں، حقیقت میں
مابعد الطبیعات	-	فطرت سے سوا غیر مادّی حقیقت، ماورائی حقیقت
غیر مترقّبہ	-	خداداد مال، وہ دولت جو بغیر محنت کے حاصل ہو جائے
پارۂ زر	-	سونے کا ٹکڑا
رَعْد	-	بجلی
مہیب	-	خوفناک، بھیانک
ژالہ باری	-	برف باری
پرلے سرے پر	-	آخری سرے پر
رپٹ	-	پھسلن
پیٹا	-	دریا کے بہنے کا راستہ، دریا کا پاٹ
کفِ دست	-	ہتھیلی
تعلّی	-	شیخی، ڈینگ
حمیّت	-	غیرت، شرم

آپ نے پڑھا

- اکثر مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ ایک آئی۔سی۔ایس۔افسر کا ٹھاٹ باٹ اور رہن سہن عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔لیکن صرف ایک معمولی سے واقعے کا اثر اس کے دل ودماغ پر اس طرح قائم ہوا جس سے وہ اپنی ساری رعونت اور افسرانہ تمکنت بھول کر عام لوگوں کے دکھ سکھ کا ساتھی بن جاتا ہے۔کہانی میں طوفان کا منظر اور افسر کے طوفان میں پھنسنے کا واقعہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ وہ آرام طلبی اور نفاست کو تیاگ کر مشکلات اور دقّتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔وہ زندگی کی سچّائیوں کو مزید قریب سے دیکھنا سمجھنا چاہتا ہے۔
- ''روشنی'' ایک سیدھی سادی بیانیہ طرز میں لکھی گئی کہانی ہے۔ پریم چند نے اس میں جہاں فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ استعمال کیے ہیں وہیں گانو میں بولے جانے والے الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔اِسی سے کہانی کا فطری ماحول قائم ہوا ہے۔
- اس کہانی میں شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ایک طرف بہار کا موسم ہے،کوئل کی کوک ہے، بھینی بھینی خوشبو ہے،سہانے قدرتی مناظر ہیں تو دوسری طرف قدرتی آفات ہیں،طوفان کی ہولناکی ہے،حالات کی خوفناکی ہے۔یہاں افسانہ نگار نے متضاد صورتِ حال کو اس طرح مربوط کیا ہے کہ پڑھنے والے رفتہ رفتہ کہانی کے سحر میں آجاتے ہیں۔
- ایک معمولی عورت کی خودداری،فرض شناسی اور توکّل پسندی نے اعلا افسر کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ تعلیم صرف اعلا ڈگریوں میں پوشیدہ نہیں۔ ''روشنی'' میں اس عورت کا اعلا کردار اور عمل ایک افسر کو اپنے فرض کی پہچان عطا کرتا ہے اور وہ ایک نابینا بوڑھے کی جان بچا کر ابدی سکون ومسرت محسوس کرتا ہے۔

کچھ اور باتیں

- اس کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ایک اعلا سرکاری افسر (آئی۔سی۔ایس۔) ہے تو دوسرا ایک صاحبِ اولاد غریب بیوہ۔دو متضاد حالات ہیں۔دونوں کرداروں کے الگ الگ ماحول اور پس منظر ہیں لیکن افسانہ نگار نے کمال خوبی کے ساتھ دونوں بے میل کرداروں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کیا ہے۔کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، دونوں قریب آتے جاتے ہیں اور اختتام تک دونوں کردار ہم خیال اور ہم مزاج ہو جاتے ہیں۔
- کہانی ''روشنی'' پریم چند کی فن کاری کی عمدہ مثال ہے۔افسانہ نگار نے بہت ہی ہنر مندی کے ساتھ واقعات کی کڑیوں کو جوڑا ہے۔بیچ میں ذیلی اور ضمنی باتیں بھی آتی ہیں لیکن وہ کہانی کے مرکزی خیال پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔یہ باتیں افسانہ نگار کے موقف اور نصب العین کو واضح کرتی ہیں۔
- پریم چند کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی کہانیوں میں مشکل،ناقابلِ فہم اور مصنوعی زبان کے استعمال

سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں دیہی علاقوں سے متعلق ہیں۔ ہندستان گانو دیہات کا دیس ہے۔ اس لیے پریم چند گانو کو اولیت دیتے ہیں اور اس مخصوص ماحول کی بولی ٹھولی کو اپنی کہانیوں میں زیادہ سے زیادہ جگہ دیتے ہیں۔

- ❑ اُن کی کہانیوں میں منظر کشی اور مکالمہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کہانی میں بھی منظر کی بہترین پیش کش موجود ہے۔ بیوہ عورت اور آئی۔سی۔ایس۔افسر کے درمیان کئی مقامات پر جو گفتگو ہوتی ہے، برجستہ اور موقع محل کے اعتبار سے مناسب ہے۔
- ❑ افسانہ ''روشنی'' پہلی بار مشہور ادبی رسالے ''ادبی دنیا'' کے نوروز نمبر بابت 1932ء شائع ہوا تھا۔ یہ اُن کے مجموعے ''واردات'' میں شامل ہے۔

آپ بتایئے

1- افسانہ ''روشنی'' پریم چند کی کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

2- آئی۔سی۔ایس۔افسر کس سواری سے معائنہ کے لیے نکلا تھا؟

3- عورت نے آئی۔سی۔ایس۔کا روپیہ کیوں واپس کر دیا؟

4- بوڑھے کو ڈوبنے سے کس نے بچایا؟

5- بیوہ عورت سے آئی۔سی۔ایس۔افسر نے کیا سیکھا؟

6- پریم چند نے اس کہانی کا عنوان ''روشنی'' کیوں رکھا؟

7- پریم چند کا اصلی نام کیا ہے؟

8- ان کی پیدائش کہاں ہوئی؟

9- دہقانی عورت کے کتنے بچّے تھے؟

10- افسر کس کی انسانیت سے متاثر ہوا؟

معروضی سوالات

(i) ان میں کون سی کہانی پریم چند کی ہے؟

(الف) کھول دو　(ب) بابا نور　(ج) کفن　(د) گرم کوٹ

(ii) ''روشنی'' کیا ہے؟

(الف) داستان　(ب) ناول　(ج) افسانہ　(د) ڈراما

(iii) آئی۔سی۔ایس۔کس علاقے میں رہتا تھا؟

(الف) شہری　(ب) کوہستانی　(ج) ریگستانی　(د) برفیلے

(iv) گڈھے میں کون گرا تھا؟

(الف) ایک عورت (ب) ایک بوڑھا (ج) ایک بچّہ (د) ایک مسافر

(v) بڈھے نے مہاتما کس کو کہا؟

(الف) آئی۔پی۔ایس۔کو (ب) آئی۔ایف۔ایس۔کو

(ج) آئی۔سی۔ایس۔کو (د) آئی۔اے۔ایس۔کو

(vi) آئی۔سی۔ایس۔نے عورت کو دیوی اس لیے کہا کیوں کہ

(الف) وہ خوبصورت تھی (ب) اس میں عزّتِ نفس اور صبر و توکّل کا مادّہ تھا

(ج) وہ مندر میں رہتی تھی (د) وہ ہر وقت پوجا کرتی تھی

درج ذیل لفظوں سے جملے بنایئے

تاریکی برہنہ ژالہ شجر حریص

بوسیدہ افق طوفان رعد ابر

اضداد لکھیے:

شب زمین خوشبو قریب غم شجر خواب حق

مندرجہ ذیل الفاظ سے اس طرح جملے بنایئے جس سے ان کی جنسیت ظاہر ہو:

مراد پیغام زندگی پانی افق آواز عکس نادم

اس افسانے میں

- ''آئی۔سی۔ایس۔پاس کر کے ہندستان آیا تو مجھے ممالک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔'' اس جملے سے کہانی ''روشنی'' کا آغاز ہوتا ہے۔ آئی۔سی۔ایس۔افسر نے ''میں'' لکھا ہے۔ کہانی میں ''میں'' کون ہوتا ہے؟ ''میں'' کے ذمّے کون سا کام تھا جسے انجام دینے کے لیے وہ بنگلے سے نکلا تھا۔ مختصراً لکھیے۔
- ''بہار کا موسم تھا.........آم کے درختوں میں بور آ گئے تھے۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ کوئل کوکنے لگی تھی۔'' کہانی میں ایسے حصّے کو کیا کہتے ہیں؟
- اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے؟ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچّے، بے کسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں

کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔'' اس عبارت کے سیاق وسباق پر غور کیجیے۔ یہ باتیں کس نے اور کس لیے کہی ہیں؟ ایک سو لفظوں میں اس کی وضاحت کیجیے۔

- اس کہانی میں ''روشنی'' کو تبدیلی ذہن یا ماہیتِ قلب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ روشنی آئی۔ سی۔ ایس۔ افسر کو کیسے ملی؟ وہ جب افسری کے دائرے سے باہر آیا تو اس نے کیا کر دکھایا؟ سو لفظوں میں لکھیے۔
- اس افسانے میں کچھ علاقائی اور دیہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی نشان دہی کیجیے۔
- بیوہ عورت مجبور ہوتے ہوئے بھی آئی۔ سی۔ ایس۔ کا پیسہ لینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

مختصر گفتگو

1- افسانہ ''روشنی'' ہمیں کیا پیغام دے رہا ہے؟
2- افسانہ ''روشنی'' میں افسر کہاں سے کہاں جا رہا تھا؟
3- افسر نے کیوں اس اندھے بوڑھے کی مدد کی؟
4- افسر نے عورت کو روپے نکال کر کیوں دیے اور اس نے کیا کیا؟

تفصیلی گفتگو

1- افسر کے مشاغل کیا تھے؟
2- عورت کے کردار سے افسر کیوں متاثر ہوا؟
3- اس کہانی میں کون سا درس پوشیدہ ہے؟
4- پریم چند کی افسانہ نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5- افسانہ ''روشنی'' پریم چند کی دیگر مشہور کہانیوں کے مقابلے آپ کو کیسی لگی؟ مدلّل بحث کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- درس دینے والی پریم چند کی دو دوسری کہانیوں کو پڑھ کر سنایئے۔
2- ہم پریم چند کی کہانی سے سبق لے کر سماج کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ دس جملے میں بتایئے۔
3- لائبریری سے پریم چند کی مشہور کہانیوں کو تلاش کیجیے اور انھیں زیراکس کرا کے ایک مجموعے کی شکل میں اپنے پاس رکھیے اور ان کا مطالعہ کیجیے۔

سیّد محمد محسن

سیّد محمد محسن جولائی 1910ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد رشید اور دادا سیّد وحید الدین تھے۔ محسن کے نانا یوسف حسین کاکو کے رہنے والے تھے۔ یہ سر سیّد کی تعلیمی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ محسن کا دادھیالی اور ننھیالی دونوں گھرانہ عصری تعلیم سے بہرہ مند تھا۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انھوں نے 1926ء میں رام موہن رائے سیمنری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1931ء میں پٹنہ کالج سے فلسفے میں آنرز کیا۔ 1934ء میں اعلا نمبروں سے ایم۔ اے۔ پاس کرنے پر انھیں گولڈ میڈل ملا اور حکومت نے انھیں ریسرچ اسکالرشپ سے نوازا۔ ایم۔ اے۔ میں خصوصی مضمون نفسیات تھا۔ 1938ء میں پٹنہ کالج میں تدریس کی ذمّے داریاں سنبھالیں۔ 1946-48ء کے دوران تحقیق کے لیے اڈنبرا یونیورسٹی (برطانیہ) میں مقیم رہے اور پروفیسر جیمس ڈریور کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانے میں اڈنبرا یونی ورسٹی میں فلسفے سے نفسیات کو علاحدہ کر کے آزاد شعبہ قائم ہو چکا تھا۔ انگلینڈ میں تحقیق کے دوران علمِ نفسیات کے مختلف ماہرین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں سے واپسی پر 1953ء میں شعبۂ نفسیات، پٹنہ یونی ورسٹی کے صدر مقرّر ہوئے اور یہ سلسلہ 1974ء میں ملازمت سے سبک دوشی تک جاری رہا۔ اس کے بعد بھی پانچ برسوں تک یو۔ جی۔ سی۔ کی اسکیم کے تحت وہ پڑھاتے رہے۔

1933ء میں محسن صاحب کی شادی مولوی ضمیر الدین کی صاحب زادی محترمہ محفوظہ سے ہوئی۔ سیّد محمد محسن نے اپنے سبھی بچّوں کو اعلا تعلیم سے بہرہ مند کیا۔ 1973ء میں انھوں نے اہلیہ کے ہمراہ حجِ بیت اللہ کیا۔ 2 مارچ 1999ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

سیّد محمد محسن ماہرِ نفسیات تھے۔ انھوں نے بیشتر انگریزی میں لکھا لیکن اردو بھی ان کی توجّہ سے محروم نہیں رہی۔ 1937ء میں ان کا نفسیاتی افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' شائع ہوا۔ اس افسانے کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1973ء میں اسی عنوان سے ان کے افسانوں کا مجموعہ طبع ہوا۔ ان کی دیگر اردو کتابیں اس طرح ہیں۔ ''نفسیاتی زاویے'' (مجموعۂ مضامین)، ''سعادت حسن منٹو، اپنی تخلیقات کی روشنی میں''، ''جائزے'' (مضامین)، ''زخموں کے پھول'' (شعری مجموعہ)، ''لمحوں کا کارواں'' (خودنوشت)۔ انھوں نے فرائڈ پر اردو میں کئی مضامین لکھے جن کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ ترقی اردو بیورو نے ان کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''ابتدائی نفسیات'' کے نام سے شائع کیا۔

سیّد محمد محسن

مختصر افسانہ

انوکھی مسکراہٹ

''کیا کر رہی ہو بیٹا؟'' بڈّھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمنا کی کے اثر سے جیسے نااُمیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔

''کُرتے میں پیوند لگا رہی ہوں باوا۔ کیا ہے؟'' جمنی نے باپ کے قریب آ کر کہا۔

''کچھ نہیں شام کے لیے چاول تو نہ ہوں گے۔ دو دن سے کوئی مُردہ نہیں آیا۔ اب صرف یہ اکنّی ہمارے پاس رہ گئی ہے۔ بیٹا جب تو بچّہ تھی اس وقت اسی قبرستان میں روز دو دو تین تین مُردے آیا کرتے تھے۔ دور دور تک کوئی اور قبرستان نہ تھا۔ مجھے دن دن بھر فرصت نہ رہتی۔ اکیلا آدمی، دفن کا سارا انتظام مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن جو ملتا اُٹھا دیتا۔ اس دن کی خبر نہ تھی۔ ایک تو یہاں اب صرف غریبوں ہی کے مُردے آتے ہیں۔ لڑ جھگڑ کر ان سے کہیں دو چار پیسے وصول ہوتے ہیں۔ برس چھے مہینے میں کوئی امیر مسافر مر گیا اور اُس کے عزیز آ گئے تو کچھ رقم مل گئی۔ لیکن آج کل تو ایسا سنّاٹا ہے کہ دو دو چار چار دن کوئی مُردہ نہیں آتا۔ اب یہ آخری اکنّی رہ گئی ہے۔ کوئی کپڑا ہو تو دو رات کے کھانے کے لیے بازار سے کچھ لیتا آؤں۔ کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا۔ کہنا باوا ابھی آتے ہیں۔''

آخری جملے نے بڈّھے کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک چمک پیدا کر دی۔ مستقبل کا تصوّر لاکھ نا امیدیوں میں گھرا کیوں نہ ہو، اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بڈھے نے اپنی لکڑی اٹھائی اور جھونپڑی سے نکل گیا۔ اس کے بدن پر ایک میلی جا بجا پیوند لگی سیاہ عبا تھی۔ اس کی کاکلیں لٹکی ہوئی تھیں اور لمبی سفید داڑھی بکھری ہوئی تھی۔ برسوں سے حجام نے انھیں ہاتھ نہ لگایا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ کمر ضعف سے جھکی ہوئی تھی۔ ناطاقتی سے پیر چلنے میں ہلتے اور قدم مشکل سے جمتا تھا۔ وہ قبرستان کا مجاور تھا۔ قبرستان آبادی سے بہت دور تھا۔ سنسان میدان میں یا تو جا بجا کچھ پختہ قبروں پر ان کے نشان نظر آتے یا بڈھے کا افلاس زدہ جھونپڑا۔ مُردوں کی اس بستی میں صرف یہ دو زندہ جانیں رہتی تھیں۔ جمنی کی ماں اس کے بچپن میں مر چکی تھی۔ بڈھے نے پھر بیاہ نہ کیا۔ وہ جمنی کو بہت چاہتا تھا۔ اس دنیا میں اس کا جمنی کے سوا کوئی نہ تھا۔

جمنی باپ کے جاتے ہی پھر پیوند لگانے بیٹھ گئی۔ اسے بھی تعجب تھا کہ اب لوگ کیوں نہیں مرتے۔ ''اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو اس کا باپ کیا کرے گا؟ دال چاول کہاں سے آئیں گے۔ وہ اپنے باپ کو پکا کر کیا دیا کرے گی؟''

وہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ اس کا ذہن ابھی ان حالات پر غور کرنے کا اہل نہ بنا تھا۔ وہ تو ابھی تصورات کی دنیا میں رہتی تھی۔ اس کا سن ہی کیا تھا۔ اس کا دماغ صرف ماضی و مستقبل کی آزاد تصویریں پیش کر سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''پار سال کیا اچھا زمانہ تھا جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا۔ اس کا باپ کتنا خوش نظر آتا تھا۔ باوجود دن رات کی مصروفیت کے۔ اپنے باپ کو کبھی اس نے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں لاتا۔ اتنی مٹھائی اس نے کبھی نہ کھائی تھی۔ کسی تہوار میں بھی نہیں۔ اس کے اچھے کپڑے سب اسی زمانہ کے تھے۔ وہ کُرتہ بھی جس میں وہ پیوند لگا رہی تھی کیسا اچھا کپڑا تھا۔ اتنا پرانا ہونے پر بھی اس کی آب و تاب ویسی ہی تھی۔ اور وہ ساڑی جو اس نے عید پر پہنی تھی۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ وہ ساڑی اسے بہت بھلی لگتی تھی۔ اب کے تہوار پر وہ پھر اسی ساڑی کو پہنے گی۔''

''جمنی!'' بڈھے نے جھونپڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پکارا۔ اس کے کاکل اور داڑھی کے بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کی شکنوں میں خاک کے ذرّے بھر گئے تھے۔ جن سے چہرے کے نشیب و فراز میں کمی ہو گئی تھی۔ قدرت کا کریمانہ ہاتھ وقت کے تخریبی عمل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھے کے کاندھے پر دو چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں۔ ان کا وزن کچھ ایسا نہ ہوگا لیکن بڈھے کی کمر اور جھک گئی تھی۔ عمر کا بوجھ اس کی پیٹھ پر کب کم تھا کہ وہ اور زیادہ وزن برداشت کر سکتا۔ زندگی کا بھی وزن ہوتا ہے جو ہر سانس کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آخیر عمر میں کمر جھک جایا کرتی ہے۔

جمنی نے گٹھریاں باپ کے کندھے سے اُتار کر زمین پر رکھ دیں۔ بڈھا چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ چہرہ کا پسینہ اٹی ہوئی خاک کو گوندھ رہا تھا اور سانس کی تیز رفتار سے چہرہ میں جو حرکت پیدا ہو رہی تھی، اس سے بھیگی ہوئی خاک کے مُرد بنی پُتلے بن رہے تھے۔ فطرت کی تخلیق یہاں بھی جاری تھی۔

''بیٹا کوئی آیا تھا؟'' اس نے جمنی سے سوال کیا۔

''نہیں باوا۔'' جمنی نے کہا۔ اور باپ کی پھٹی ہوئی کفنی تہ کر کے الگنی پر ڈالنے لگی۔

''کوئی نہیں؟ اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ باپ دادا کا پیشہ ہے چھوڑا نہیں جاتا۔ پیالہ لے کر در بدر بھیک مانگنا تو اس سے بہتر ہوتا۔ پھر اپنی غیرت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس وقت لوگ مجھ کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص شاہ صاحب شاہ صاحب کہتا ہے۔ بھیک مانگنے نکلوں گا تو جانے کون کس طرح پیش آئے۔ مگر اب اس پیشہ سے روٹی کیوں کر چلے گی۔ جوانی تو اس عیش میں گزری، اب بڑھاپے میں ایسی مصیبت یا اللہ!'' بڈھا یہ کہہ کر رونے لگا۔ آنسو کے دو بڑے بڑے قطرے گرد آلود چہرے پر اپنا نشان چھوڑ کر بڈھے کی داڑھی میں کھو گئے۔ باپ کو روتا دیکھ کر جمنی باپ کے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ دنیا والے کسی کی موت پر روتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہا رہے تھے۔

رات کے دو بجے تھے۔ بڈھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ جمنی بے فکری کی نیند سے سو رہی تھی۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ بڈھے کا دماغ مستقبل پر غور کرنے میں منہمک تھا۔ ''اس کے بعد دنیا میں جمنی کا کوئی نہیں۔ اس کی زندگی کس طرح گزرے گی؟ اگر وہ اسے بیاہنے سے پہلے مر گیا تو پھر اس کا بیاہ کیوں کر ہوگا۔'' اسے جمنی کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔ رات کی تاریکی میں جھونپڑی کے اندر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ایک لو تھی۔ لیکن اس کے دماغ کے اندھیارے میں کہیں روشنی کا نشان نہ تھا۔

''شاہ صاحب!'' ماحول کی بسیط خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز اس کے کان میں پہنچی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جھونپڑی کے باہر ایک شخص اسے پکار رہا تھا۔

''کون ہے؟ مجھ کو بلاتے ہو۔ کیا کام ہے؟''

''دلّی والے سوداگر کے لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ جنازہ صبح سویرے یہاں آئے گا۔ آپ قبر وغیرہ کا انتظام درست رکھیے۔''

''دلّی والے سوداگر کا نام سن کر بڈھے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک پردیسی بڑے تاجر تھے۔ بڈھے کو روپے کافی مل جائیں گے۔ غایت مسرّت میں اس نے رات کا باقی حصہ آنے والے روپیوں کی چمک اور چھنک کے تصوّر میں جاگ کر گزار دیا اور صبح سے پہلے قبر کے انتظام میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹانگوں میں پھرتی آگئی تھی اور کمر کی خمیدگی میں کچھ کمی۔ مسرّت و انبساط میں ہی قوت و توانائی کا راز مضمر ہے۔ اس کا لگاؤ مستقبل کے خیالی شہ پاروں ہی سے کیوں نہ ہو۔

جمنی صبح اُٹھ کر جھونپڑی میں جھاڑو دے رہی تھی۔ باہر سے کچھ لوگوں کے گزرنے کی آواز آئی۔ جمنی دروازے پر آکر دیکھنے لگی۔ بہت سارے آدمی ایک جنازہ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ کچھ لوگ آپس میں باتیں کرتے جارہے تھے۔

ایک نے کہا: ''کیسا کڑیل جوان تھا۔''

دوسرے نے جو قریب ہی سے جنازہ کے ساتھ ہو گیا تھا، سوال کیا: ''آخر اس بے چارے کو ہوا کیا تھا؟''

''کیا بتائیں بھائی۔'' پہلے نے جواب دیا۔ ''ایک عورت سے اس کا کچھ دنوں سے تعلّق تھا۔ اس چڑیل نے اپنے ایک آشنا کے بہکانے سے کل رات اس بیچارے کو زہر دے دیا۔ دن بھر اس کی حالت خراب رہی اور آخر سہ پہر سے پہلے رخصت ہو گیا۔ افسوس، میرا بڑا دوست تھا۔''

جمنی ان کی گفتگو بڑے غور سے سنتی رہی اور جب وہ کچھ آگے نکل گئے تو جنازے پر نظریں جمائے بے اختیارانہ ہنسنے لگی اور پھر جھونپڑی کے اندر جا کر جانے کب تک ہنستی رہی۔ جھاڑو دینے میں آج اسے ایک خاص لذّت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اور دن جلد جلد جھاڑو دے کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو جایا کرتی لیکن آج اس کا جی چاہتا تھا کہ برابر جھاڑو دیتی رہے اور ساتھ ہی ہنستی جائے۔ آج اس کے جھاڑو دینے کے انداز میں رقص کی کیفیت تھی۔ جھاڑو کی حرکت اور کمر کی جنبش میں ایک انوکھی ہم آہنگی تھی۔

بڈھا قبرستان سے جھونپڑی میں آیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ چہرے پر غایت انبساط سے ایک ہلکا گداز پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے چہرے کی شکنوں میں پھیلاو آ گیا تھا۔ بڈھے کا مُردہ شباب اپنے اعادہ کی کوشش کر رہا تھا۔ مسرّت کی برقی رَو نے اس میں جان ڈال دی تھی۔ انسان اگر ہمیشہ مسرور ہی رہتا تو وہ کبھی بڈھا نہ ہوتا۔ لیکن پھر مسرّت بھی تو بے معنی و بے اثر ہو جاتی۔ بڈھے کو روپے کافی مل گئے تھے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھیں جمنی کے حوالے کیا۔ جمنی نے ایک سال سے اتنے روپے نہ دیکھے تھے۔ دیر تک ہتھیلی پر رکھے انھیں دیکھتی رہی۔ چاندی کے سکوں کی تابانی اس کے چہرے پر چمک پیدا کر رہی تھی۔

''جمنی!'' حنیف نے باہر سے آواز دی۔ اس کے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔ ہر ہفتہ اُسے پاس کی بستی میں ڈاک لے جانا ہوتا تھا۔ آتے جاتے وہ اکثر بڈھے کے یہاں کچھ دیر بیٹھ جاتا۔ جمنی اپنے باپ کے علاوہ صرف حنیف کو جانتی تھی۔ وہ اس سے بے باکانہ باتیں کرتی۔ وہ سوسائٹی کی ان رُکاوٹوں سے آزاد تھی جنھیں شرم و حجاب کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حنیف جوان تھا۔ خوبصورت بدن، لانبے قد والا۔ بڈھے کو اس سے اس قدر رانس ہو گیا تھا کہ جمنی سے اس کا آزادانہ ملنا اسے ناگوار نہ ہوتا۔

''کیوں؟ شاہ صاحب کہاں ہیں؟''

''بازار گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ تم اس ہفتہ نہ آئے تھے۔ میں تمھاری راہ دیکھتی رہی۔ باوا بھی پوچھ رہے تھے۔''

''اس دن میں چھٹّی لے کر گھر چلا گیا تھا۔ تم راہ کیوں دیکھتی رہیں۔ کیا کوئی کام تھا؟''

''نہیں تو یوں ہی پوچھ لیا۔ گمان ہوا کہ شاید تم بیمار پڑ گئے۔ نہیں آنا تھا تو پہلے کہہ دیتے۔ ہم لوگوں کو کچھ خیال نہ ہوتا۔''

''گھر سے بھائی کی ایکا ایکی چٹھی آ گئی، وہ بیمار ہو گئے تھے۔ اُسی دن چھٹّی کی درخواست منظور کرا کر چلا گیا۔ تمھاری طرف آنے کا وقت نہ ملا۔ کیا تم دن بھر انتظار کرتی رہیں؟''

حنیف کی گفتگو میں محبت کی حلاوت تھی۔ اس کی آنکھیں اس کا راز فاش کر رہی تھیں۔ حنیف کو جمنی سے محبت تھی۔ اتھاہ۔ گو اس کا احساس ان دونوں میں سے کسی کو نہ ہوا تھا۔ محبت اپنا پہلا وار چوری سے کیا کرتی ہے۔ اس طرح کہ محبت کرنے والے کو اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ پھولوں کی مار سے چوٹ لگتی ہے لیکن اس چوٹ کا احساس چوٹ کی طرح نہیں ہوتا۔

''کیوں انتظار کرتی رہتی؟ کیا کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا۔''

جمنی کے جواب میں شوخی و شرارت کی آمیزش سے ایک دل کش لوچ پیدا ہو گیا تھا۔ حنیف اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''اچھا اب جانا ہے۔ بہت سی ڈاک باقی رہ گئی ہے۔ شاہ صاحب کو میرا سلام کہہ دینا۔''

بڈّھا بخار سے ہانپ رہا تھا۔ جمنی سرہانے بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ بڈّھے کو دو دن سے بخار تھا، شدّت کی کھانسی کے ساتھ۔ اس سنسان آبادی میں کوئی نہ تھا کہ بڈّھے کے لیے کہیں سے دوا لا کر دیتا۔ بڈّھے کا بخار بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ دماغ پر اثر ہو گیا۔ جمنی نے آج تک کسی کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں مر گئی تھی اور اس کا باپ کبھی اس طرح بیمار نہ ہوا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس بیماری کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں بڈّھے کی تکلیف دیکھ کر اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ باپ کو ''باوا، باوا'' کہہ کر آواز دیتی اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو اسے ایک غم آلود حیرانی و استعجاب ہو جاتا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ بڈّھا دم توڑ رہا تھا اور جس طرح اس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے سوروں کو زمین کے نیچے چھپا دیا تھا، اس کا نشان بھی خاک کے اندر کھود دیا جانے والا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے بڈّھے کی روح پرواز کر گئی۔ جمنی نے مُردے ہزاروں دیکھے تھے لیکن کفن کے اندر ڈھکے ہوئے، موت کا منظر اس نے پہلی بار دیکھا۔ اس کے باپ کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، سانس کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی، بدن سرد ہو گیا تھا۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کے دل میں گداز پیدا ہوا اور وہ بے اختیارانہ رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ اُس کا باپ اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے باپ کی اس غیر معمولی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے آنسو اس کے فہم و ادراک کی مجبوری کا اظہار تھے۔

صبح کو حسبِ معمول حنیف ڈاک کا تھیلا لیے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جمنی اُسے دیکھ کر مُسکرا دی۔ وہ دیر سے حنیف کی منتظر تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے باپ کی اس غیر معمولی کیفیت کا راز اسے بتا سکے گا۔ حنیف سے اس نے بارہا مختلف باتوں کی بابت سوال کیا تھا اور اس نے برابر اس کی تشفی کر دی تھی۔

''دیکھو تو باوا کو کیا ہو گیا ہے؟''

حنیف نے بڈّھے کے قریب جا کر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل آئے۔ جمنی بھی رونے لگی۔

''شاہ صاحب سدھار گئے۔ ان کے دفن کا سامان کرنا چاہیے۔'' حنیف نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر میں حنیف چند آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا۔ جنازہ تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جایا جانے لگا تو جمنی کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرانے لگی اور جب تک جنازہ اس کی نظروں کے سامنے رہا مسکراتی رہی۔ جنازہ دفن ہو چکا تو ایک بارگی اس پر افسردگی چھا گئی۔ قبرستان سے لوٹنے والوں میں اس کا باپ نہ تھا۔ یہ اُس کے لیے ایک غیر معمولی مشاہدہ تھا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور مسکراہٹ کی جگہ آنسوؤں کی دو بڑھتی ہوئی دھاروں نے لے لی۔

حنیف جمنی کو اپنے گھر لے گیا اور دونوں کا بیاہ ہو گیا۔ جمنی کے لیے حنیف کا گھر ایک نئی دنیا تھی۔ وہ پہلے صرف اپنے باپ اور حنیف کو جانتی تھی۔ عورت و مرد کا فرق تک اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اُسے کسی عورت سے سروکار نہ رہا تھا۔ یہاں اُسے بہتیرے عورتوں سے واسطہ تھا۔ قبرستان کے ماحول کے لیے جمنی اپنے باپ کے ساتھ مر چکی تھی اور جس طرح اس کا باپ اس دنیا سے گزر کر ایک دوسرے عالم میں پہنچا ہوا تھا۔ جمنی بھی ایک عالم سے منتقل ہو کر دوسری دنیا میں بس رہی تھی۔ ہم اس زندگی میں بھی

کتنی بار مر کر جیتے ہیں۔ جوانی کا نمود بچپن کی موت سے ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی آمد جوانی کے لیے پیامِ مرگ ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں لوگ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے۔ حنیف جمنی کو دیوانہ وار چاہنے لگا۔ وہ اُس سے ایک منٹ کو علیحدہ ہونا گوارا نہ کرتا تھا۔ جمنی بھی حنیف کی عدم موجودگی میں بے قرار سی رہتی۔

ہم سایہ کا لڑکا شب کو مر گیا۔ جمنی کو صبح سویرے خبر ملی۔ وہ جلد جلد گھر کا کام کر کے ہم سایہ کے ہاں جانے لگی۔ وہ آج بہت خوش تھی، اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی دلکشی و جاذبیت کم ہوگئی تھی۔ حنیف اس کی مسرّت کا سبب نہ سمجھ سکا۔ جس وقت وہ ہم سایہ کے یہاں جا رہی تھی حنیف نے اس سے سوال کیا۔

"کیوں آج تم بہت خوش معلوم ہوتی ہو؟"

جمنی نے کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ حنیف کے دل و دماغ پر جمنی کی محبت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ وہ جمنی کے سامنے کچھ سوچ نہ سکتا تھا۔ اس بے معنی تبسّم پر اس نے جمنی کے جانے کے بعد کوئی غور نہ کیا۔

جمنی ہم سایہ کے ہاں گئی تو بچّہ کی لاش کو اس وقت کفنایا جا رہا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس منظر سے لذّت حاصل کر رہی تھی۔ برابر کی ایک عورت نے جمنی کی اس کیفیت کو دیکھ لیا۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ جمنی ان سبھوں میں بہت ہر دلعزیز تھی۔ اس کے خلاف کسی کو کسی طرح کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔

محلّہ میں کوئی موت ہوتی تو جمنی وہاں ضرور پہنچتی اور دور کھڑی ہو کر مسکراتی رہتی۔ اُس کی اِس انوکھی مسرّت کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا اور محلّہ والیاں اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ حنیف کو بھی اس کی بھنک ملتی رہتی۔ وہ جمنی سے اس کی بابت سوال کرتا تو جمنی مخبوط و سراسیمہ سی ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بے گناہ پر جرم کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ حنیف نے جمنی کو تاکید

کردی کہ وہ آئندہ کسی کی موت کی خبر سن کر وہاں نہ جایا کرے۔ جمنی نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جب کبھی اُسے موت کی خبر ملتی اس کے قدموں میں بجلی کی سی پھرتی آجاتی اور وہ غیر ارادانہ گھر سے نکل جاتی۔ حنیف کو جمنی سے کچھ خوف پیدا ہونے لگا تھا۔

جمنی کا بچّہ تین دن سے بیمار تھا۔ جمنی دن رات اس کی خدمت میں مصروف تھی۔ ڈاکٹر نے نمونیہ تجویز کیا۔ حنیف نے دوا کی دو شیشیاں جمنی کو لا کر دیں۔ ایک کھانے کی اور دوسری سینہ پر مالش کرنے کی۔ مالش کرنے والی دوا پر پوائزن کی چٹ لگی تھی۔

''اس دوا کو الگ رکھنا اس میں زہر ہے۔'' حنیف نے جمنی سے کہا۔ جمنی نے دوا الگ طاق میں رکھ دی۔ بچّہ کی حالت شام تک کچھ سنبھلنے لگی۔ بخار میں کمی اور کھانسی میں تخفیف ہوگئی۔ جمنی تین شب سے نہ سوئی تھی۔ بچّے کے پہلو میں بیٹھی سوگئی۔

آدھی رات کو جمنی ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ اس کا باپ قبرستان میں ہے۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک لاش کاندھے پر اٹھائے قبرستان کو جا رہے ہیں اور آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ''ایک عورت نے اس بے چارے کو زہر پلا دیا۔'' جمنی یکا یک بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر موت کا سا پیلا پن لگا۔ آنکھیں باہر کو نکل آرہی تھیں۔ لبوں پر تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک خوفناک مسکراہٹ تھی۔ اس کے اعضا کڑے ہو رہے تھے۔ اس کی مُردہ سی ٹانگوں میں یکا یک جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے طاق کی طرف تیزی سے قدم بڑھایا اور زہر والی شیشی کو جھپٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا چہرہ اور بھیانک ہوگیا۔ موت کا فرشتہ اس کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔ شیشی مٹھی میں جکڑے وہ نہایت سرعت سے بچّہ کے قریب آئی اور اس کے نازک جبڑے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھول کر جن میں آہنی سلاخوں کی سی سختی آگئی تھی، شیشی کی ساری دوا بچّہ کے منہ میں انڈیل دی اور کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بستر پر گر گئی۔ وہ جلد ہی سوگئی۔ کچھ دیر بعد بچّہ کے کراہنے سے اس کی نیند ٹوٹی۔ بچّہ کرب و اذیّت سے تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ سارے جسم میں تشنج تھا۔ بچّہ کی حالت دیکھ کر جمنی نے اسے کلیجہ سے لگا لیا اور ڈھاڑیں مار کر رونے لگی۔ حنیف قریب ہی سویا تھا۔ اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ بچّہ کی حالت اخیر تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بے جان ہوگیا۔ صبح کی روشنی میں حنیف کی نظر زہر کی خالی شیشی پر پڑی جو بچّہ کے سرہانے پڑی تھی۔

''تم نے بچّے کو دوا رات کس وقت دی تھی؟'' حنیف نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

''میں تو شام سے سوئی تھی۔ اٹھی تو اس کی یہ حالت تھی۔'' جمنی نے سسکتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ خالی شیشی یہاں کہاں سے آئی؟'' حنیف نے شیشی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جمنی کی نظر شیشی پر پڑی۔ اسے خود حیرت تھی کہ اسے طاق میں سے کون لایا تھا۔ جمنی کا استعجاب دیکھ کر حنیف کا سر چکرانے لگا۔ اس کا دماغ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ زہر کی شیشی اس نے طاق میں رکھ دی اور بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔ صبح کو محلّہ والیاں بچّہ کی خیریت پوچھنے آئیں تو ایک طرف حنیف بستر پر پڑا تھا، دوسری طرف جمنی غم سے چور بچّہ کو دیوانہ وار چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی۔ بچّہ کی موت پر کسی کو تعجب نہ تھا۔ بچّہ کی حالت دن میں ہی غیر تھی۔ محلّہ والوں نے مل کر بچّہ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ حنیف کو ہوش نہ تھا۔ سبھوں نے سمجھا کہ پہلی چوٹ لگی ہے، غم سے چور ہو رہا ہے۔ بچّہ کی لاش جب قبرستان کو لے جانے لگے

تو جمنی یک بارگی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی نظریں جنازے پر لگی تھیں اور چہرے پر وہی پراسرار تبسّم تھا۔

حنیف بستر پر گرا تو پھر نہ اُٹھا۔ جمنی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہیبت ناک دیونی کی صورت ہر وقت گھومتی رہتی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ جمنی اس کا گلا دبا رہی ہے اور وہ یکبارگی چیخ اٹھتا۔ جمنی کی بے معنی مسکراہٹ اس کے دل و دماغ میں چبھ رہی تھی۔ اس کے جسم میں خوف و ہراس سے شدّت کا لرزہ رہتا۔ اس کے حواس کسی وقت بجا نہ ہوتے تھے۔ اس کا بھائی اس کی بیماری کی خبر سُن کر آ گیا۔ اس نے سارے جتن کر ڈالے لیکن حنیف کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ جمنی غم سے گھل کر آدھی ہوگئی تھی۔ آخر ایک دن، رات کے دو بجے حنیف کی حالت بالکل غیر ہوگئی۔ اس کا بھائی سرہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ جمنی الگ منہ چھپائے رو رہی تھی۔ حنیف کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''جمنی ڈائن ہے۔ اس سے مجھ کو بچاؤ، یہ مجھ کو کھا جائے گی۔ زہر اس نے زہر ....'' اتنا کہنے پر اس کی آواز بند ہوگئی اور اس کا بدن ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوگیا۔ حنیف کے بھائی نے اُس کے ہذیان پر اتنی توجہ نہ کی۔ وہ بچّوں کی طرح ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ صبح کو حنیف کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد قبرستان لے جانے لگے تو جمنی پر وہی غیر معمولی تبسّم کھیل رہا تھا۔ وہی ڈراونی ہنسی۔ موت کی دیوی کو اگر کبھی ہنسی آتی ہوگی تو اس کا تبسّم بھی ایسا ہی ہیبت ناک ہوگا۔ حنیف کے بھائی نے جمنی کی مسکراہٹ دیکھ لی۔ اس کا دماغ فوراً حنیف کے آخری الفاظ کی طرف منتقل ہوگیا۔ دفن سے واپس آیا تو اس نے جمنی کو بلا کر پوچھا۔ مُردار! شوہر کی موت پر مُسکراتی کیوں تھی؟''

جمنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے سکوت اختیار کیا۔ حنیف کے بھائی کو یقین ہوگیا کہ جمنی نے حنیف کو زہر دے دیا۔ خبر اُڑتی پڑتی تھانہ تک پہنچ گئی۔ پولس تفتیش کے لیے آ گئی۔ حنیف کے بھائی نے حنیف کا موت کے قبل کا بیان اور جنازہ کو دیکھ کر جمنی کا اظہارِ مسرّت یہ دونوں باتیں پولس کو بتا دیں۔ جمنی حراست میں لے لی گئی۔ مکان کی تلاشی ہوئی۔ طاق میں زہر کی خالی شیشی موجود تھی۔ پولس کے نزدیک گمان و شبہ کی کوئی گنجایش نہ رہی۔

جمنی پر خون کا مقدمہ چلایا گیا۔ واقعات متعلقہ جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

جمنی کو قیدِ دوام کی سزا ہوگئی۔

جمنی اب تک قید خانہ میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ وہ بہت اداس و غمگین رہتی ہے۔ لیکن اب بھی جب اس کی نظر کسی قیدی کی میّت پر پڑ جاتی ہے تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے اور دیر تک دیوانہ وار ہنستی رہتی ہے۔

لفظ و معنی

عزیز	–	پیارا، نزدیک کا رشتہ دار
عبا	–	ایک عربی پوشاک، جبّہ، چغہ
ضعف	–	کمزوری، بے ہوشی
مجاور	–	قبروں کی دیکھ بھال کرنے والا، زیارت کرانے والا، مزوّر

افلاس	-	غریبی، مفلسی
تانتا	-	قطار، بھیڑ، مجمع
نشیب وفراز	-	نیچ اونچ، اتار چڑھاو
کریمانہ	-	کرم اور مہربانی کا، فیاضانہ، سخی کے مانند
تخریبی عمل	-	بگاڑنے والا کام، تعمیری عمل کی ضد
خردبینی	-	خردبین کے سہارے باریک چیزوں کو دیکھنا (جنھیں ننگی آنکھوں سے نہ دیکھا جاسکتا ہو)
تخلیق	-	پیدا کرنا، بنانا، خلق کرنا
منہمک	-	کسی کام میں پوری توجہ سے لگا ہوا، کسی کام میں بہت مصروف
بسیط	-	بچھا ہوا، خالص، بے آمیزش، کشادہ
غایت مسرّت	-	بہت خوشی، حد درجہ خوش ہونا، انتہائی مسرّت
خمیدگی	-	ٹیڑھا پن، جھکاو، خم، کجی
مُضمر	-	چھپا ہوا، پوشیدہ، مخفی، دل میں رکھا گیا
شہ پارہ	-	بہترین حصّہ، بہترین فن پارہ
آشنا	-	جانا پہچانا ہوا، شناسا، جان پہچان والا
گداز	-	پگھلا ہوا، نرم، ملائم، پگھلانے والا
شباب	-	جوانی
اعادہ	-	دہرانا، لوٹانا، بار بار کرنا
برقی رَو	-	بجلی کی ترنگ، لہر، بجلی کی رو
تابانی	-	چمک، تابش، نور، روشنی
اُنس	-	اپنا پن، محبت، اُنسیت، پیار، رغبت، میل جول
حلاوت	-	مٹھاس، شیرینی، ذائقہ
فہم وادراک	-	سمجھ داری، عقل مندی، سمجھ بوجھ
نمود	-	ظاہر ہونا، ظہور، علامت
پیامِ مَرگ	-	موت کا پیغام
ہردل عزیز	-	سب کا پیارا، سب کا محبوب، سب کا پسندیدہ
مشتبہ	-	جس میں شک ہو، جس میں شبہ ہو، مشکوک
مخبوط وسراسیمہ	-	خوف زدہ، گھبرایا ہوا، بدحواس، خبطی، پاگل، دیوانہ

تخفیف	-	کمی، گھٹاو
جنبش	-	حرکت، گردش، ہلنا
جشن	-	خوشی کی محفل، خوشی کا دن
پُراسرار تبسم	-	معنیٰ خیز مسکراہٹ، وہ مسکراہٹ جس کے پیچھے کوئی بھید چھپا ہو
ہیبت ناک	-	خوفناک، ڈراونا، مہیب
مُنتقِل	-	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والا
سکوت	-	خاموشی
تفتیش	-	چھان بین، کھوج، تحقیقات، پوچھ تاچھ
حراست	-	گرفتاری، نظر بندی، قید، نگرانی
متعلقہ	-	متعلّق کی تانیث، تعلق رکھنے والی

آپ نے پڑھا

- کہانی ''انوکھی مسکراہٹ'' ایک خاتون کی نفسیات کو اُجاگر کرتی ہے۔ وہ ایک گورکن کی لڑکی ہے۔ قبرستان میں آتے ہوئے مُردوں کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگتی ہے کیوں کہ اس کے باپ کو مُردے دفن کرنے کے لیے پیسے ملیں گے۔ وہ خوب کھائے گی، اچھے اچھے کپڑے پہنے گی۔ موت پر خوش ہونا بڑی عجیب وغریب اور غیر فطری بات ہے لیکن کہانی پڑھ لینے کے بعد اس لڑکی (جمنی) کا خوش ہونا غیر فطری نہیں محسوس ہوتا۔ جمنی کی مسکراہٹ اس کہانی کی روح ہے جسے بجا طور پر سیّد محمد محسن نے ''انوکھی مسکراہٹ'' قرار دیا ہے۔
- محمد محسن نے جمنی کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو آزادانہ اور منطقی طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار چوں کہ خود ماہر نفسیات ہیں، اس لیے انھوں نے ''انوکھی مسکراہٹ'' کو ایک شاہکار نفسیاتی کہانی بنا دیا ہے۔
- دوسری بہت سی کہانیوں کے برعکس ''انوکھی مسکراہٹ'' میں ایک بالکل جداگانہ ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ قبرستان، مُردے، کفن، دفن، گورکن، یہ ساری چیزیں کہانی کی فضا کو پُراسرار بنا دیتی ہیں۔ جمنی کی معنی خیز مسکراہٹ، بچپن میں ایک خاص حالت میں شروع ہوتی ہے اور آگے چل کر بھی جاری رہتی ہے۔ یہ مسکراہٹ غیروں کی موت پر بھی ہے اور اپنوں کی وفات پر بھی۔ یہ مسکراہٹ آغاز میں معیشت سے تعلق رکھتی ہے لیکن آگے چل کر یہ سرشت کا حصہ بن جاتی ہے اور ایک نفسیاتی مسئلے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔
- ''انوکھی مسکراہٹ'' سیّد محمد محسن کا پہلا افسانہ ہے اور سب سے زیادہ مقبول بھی ہے۔ یہ سہل اور سادہ اسلوب میں لکھا گیا نہایت پُراثر افسانہ ہے۔ بچپن میں دوسروں کی میت کو دیکھ کر مسکرانے والی بچّی شادی کے بعد بھی اپنی اس عادت سے باز نہیں آتی۔ وہ پاس پڑوس کیا، اپنے بچّے اور شوہر کی میت دیکھ کر بھی مسکراتی ہے۔ نتیجے کے طور

پر وہ شک کے دائرے میں آجاتی ہے اور قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر قیدِ دوام کی سزا پاتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے یہ باور کرانا چاہا ہے کہ سب کے سب جمنی کی پُر اسرار مسکراہٹ کو دیکھتے ہیں اور اسے سنگین جرم کا مرتکب ثابت کرتے ہیں لیکن کوئی اس کے نفسیاتی احوال اور مسائل کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ اس کی بے بسی اور بے چارگی ناگفتہ بہ ہے۔ اس لیے وہ ہر طرف سے مصائب کی مار سہتی ہے لیکن اُف تک نہیں کرتی۔

- اس کہانی کا نہایت ہی المناک حصہ وہ ہے جہاں گورکن یہ کہتا ہے کہ اب ہماری قسمت بگڑ گئی ہے۔ ورنہ اتنی کم موت شہر میں شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔ گورکن کی یہ بات بہ ظاہر بہت ناگوار اور اوچھی ہے۔ موت کی تمنا کرنا حیوانی سوچ کی دلیل ہے لیکن میّت نہیں آنے کے سبب جس غربت اور تنگ حالی سے باپ بیٹی کو گزرنا پڑتا ہے، وہ حد درجہ دردناک اور قابلِ رحم ہے۔ وہ زار و قطار روتے ہیں اور دنیا والوں کی زندگی پر آنسو بہاتے ہیں۔ کہانی میں ان دو موقعوں کو پیش کر کے افسانہ نگار نے ہمیں کشمکش میں ڈال دیا ہے کہ ہم بڈّھے گورکن کی بات کو غلط مانیں یا اس کے حالات کو۔

کچھ اور باتیں

- اس کہانی میں دو مرکزی کردار ہیں۔ گورکن اور اس کی بیٹی جمنی۔ اس کے علاوہ حنیف اور اس کے بھائی کا بھی کردار ہے لیکن پوری کہانی اوّل الذکر دو کرداروں کے اِرد گرد ہی گھومتی ہے۔ ڈرامے کی طرح کہانی میں بھی مکالموں سے اہم کام لیا جاتا ہے۔ ''انوکھی مسکراہٹ'' کے مکالمے چست اور حسبِ حال ہیں۔ قبرستان کے مناظر اور بوڑھے کی جھونپڑی کے حالات وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتے ہیں۔ گہما گہمی سنّاٹے میں بدلتی ہے۔ خوشی تکلیف اور مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔
- ''انوکھی مسکراہٹ'' جیسے نفسیاتی افسانے اردو میں زیادہ نہیں لکھے گئے۔ ممتاز مفتی، آغا بابر، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے یہاں اس انداز کے افسانے ملتے ہیں۔ اس قبیل کی کہانیوں کے ذریعے کرداروں کے داخل میں اُتر کر افسانہ نگار ان کی سرگرمیوں کو باریکی سے سمجھنے اور ان سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کہانیوں کے ذریعے زندگی کی ان گہرائیوں تک ہماری رسائی ہو پاتی ہے جہاں تک ہم خود سے بہ آسانی نہیں پہنچ سکتے۔

آپ بتائیے

1- سیّد محمد محسن کس طرح کے افسانہ نگار تھے؟
2- اُن کی سب سے مشہور کہانی کون سی ہے؟
3- شادی سے قبل جمنی کہاں اور کس کے ساتھ رہتی تھی؟
4- جمنی کا باپ کیوں زار و قطار رونے لگا؟

5- جمنی مُردے دیکھ کر کیوں ہنستی تھی؟

6- حنیف کی موت کن حالات میں ہوئی؟

7- حنیف نے ڈائن کس کو کہا اور کیوں کہا؟

8- اس افسانے میں کون کون سے کردار آئے ہیں؟

9- یہ کہانی کس وجہ سے اہمیت کی حامل ہے؟

10- سیّد محمد محسن کے افسانوی مجموعے کا کیا نام ہے؟

درج ذیل سے مناسب جواب منتخب کیجیے

(i) جمنی کا باپ کیا کرتا تھا؟

(الف) مزدوری (ب) تجارت (ج) کاشت کاری (د) مجاوری

(ii) جمنی کے شوہر کا کیا نام تھا؟

(الف) شریف (ب) حنیف (ج) نفیس (د) عزیز

(iii) جمنی کا شوہر کیا تھا؟

(الف) گورکن (ب) سپاہی (ج) ڈاکیہ (د) کسان

(iv) بوڑھا مجاور کس مرض سے مرا؟

(الف) دمّہ (ب) بخار (ج) چیچک (د) پلیگ

(v) حنیف کا بچّہ کیسے مَرا؟

(الف) تپ دق سے (ب) گرنے سے (ج) زہر سے (د) بھوک سے

(vi) جمنی کے خلاف تھانے میں رپورٹ کس نے کی؟

(الف) حنیف کے باپ نے (ب) حنیف کے دوست نے

(ج) حنیف کے بھائی نے (د) حنیف کے پڑوسی نے

(vii) جمنی کس الزام میں جیل گئی؟

(الف) قتل (ب) چوری (ج) زنا کاری (د) مار پیٹ

دیے گئے الفاظ کی ضد لکھیے:

شام مُردہ مصیبت مشکل مستقبل

صحیح جوڑے ملائیے:

(1) کوئی آئے تو میرا انتظار کرانا	(i) بڈّھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا
(2) اگر مُردے آنا بند ہو گئے تو اس کا باپ کیا کرے گا	(ii) جنازہ صبح سویرے یہاں آئے گا
(3) رات کے دو بجے تھے	(iii) وہ بہت اُداس اور غمگین رہتی ہے
(4) دلّی والے سوداگر کا لڑکا مر گیا	(iv) دال چاول کہاں سے آئیں گے
(5) جمنی اب قید کی زندگی گزار رہی ہے	(v) کہنا کہ باوا ابھی آتے ہیں

اس افسانے میں

- ''کیا کر رہی ہو بیٹا'' بڈّھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔ اس کے دل کی غمناکی کے اثر سے، جسے ناامیدیوں نے برف کی طرح سرد کر دیا تھا۔''
اس اقتباس سے ''انوکھی مسکراہٹ'' کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سے صورت حال کی صحیح ترجمانی کا کام لیا گیا ہے۔ سیّد محمد محسن نے اس مایوسی بھرے حالات کے ذریعہ کس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مختصراً لکھیے۔
- ''پارسال کیا اچھا زمانہ تھا۔ جب سارے شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ قبرستان میں دن بھر لاشوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔'' ان جملوں کی تشریح کیجیے۔
- ''رات کے دو بجے تھے۔ بڈّھا چٹائی پر لیٹا کھانس رہا تھا، جمنی بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ رات نہایت تاریک اور بھیانک تھی۔ ان جملوں میں منظر نگاری کی گئی ہے۔ افسانے میں منظر نگاری سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ سو لفظوں میں لکھیے۔
- اس افسانے میں بوڑھے اور مفلوک الحال باپ کی لاچاری بیان کی گئی ہے ساتھ ہی ایک ایسی لڑکی کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے جو موت کو خوشی کے طور پر لیتی ہے۔ ان دو حالات کو پیش کر کے افسانہ نگار نے افسانے کی تخلیق کی ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ سو جملوں میں لکھیے۔

آیئے، کچھ کریں

1- سیّد محمد محسن کی کتابوں کو اپنی لائبریری میں تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔
2- سیّد محمد محسن کی حیات اور شخصیت پر اگر کوئی کتاب بازار میں مل جائے یا اسکول کی لائبریری میں موجود ہو تو اسے حاصل کر کے پڑھیے۔
3- سیّد محمد محسن کی حیات اور تصانیف کو ایک چارٹ پیپر میں دکھایئے۔